رضوان اللہ

میاں بیویوں کے سربراہ ہیں

قرآن مجید کی آیت ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ. (النساء ۴:۳۴)

''(میاں اور بیوی کے تعلق میں بھی اِسی اصول کے مطابق) مرد عورتوں کے سربراہ بنائے گئے ہیں، اِس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور اِس لیے کہ اُنھوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ پھر جو نیک عورتیں ہیں، وہ (اپنے شوہروں کی) فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اِس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔'' (البیان ۱/۴۸۸)

www.javedahmadghamidi.com

اگر ترکیب کلام کی رعایت رہے اور زبان کی نزاکتیں بھی ملحوظ رکھی جائیں تو مذکورہ بالا ترجمہ، ہمارے نزدیک آیت کے مدعا کا صحیح ترین ابلاغ ہے، لیکن اشراق نومبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک مضمون نے جو پروفیسر خورشید عالم صاحب کی نگارشات پر مشتمل ہے، اس ترجمہ پر کچھ سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ ان کا یہ مضمون اصل میں تو ایک عالم دین کے مقالے پر تنقیدی نظر سے لکھا گیا تھا اور وہی صاحب اس کا جواب دینے کا حق رکھتے تھے، لیکن اس میں قرآن مجید اور بالخصوص، مذکورہ آیت کی تفہیم سے متعلق چند مسائل اس طرح زیر بحث آگئے ہیں کہ ہم جیسے طالب علموں کے لیے بھی اپنی گزارشات پیش کرنے کا ایک حد تک جواز پیدا ہو گیا ہے۔

اس آیت میں 'الرجال' کا ترجمہ مرد اور 'النساء' کا ترجمہ عورت کرنے پر پروفیسر صاحب کو کچھ تحفظات ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ مرد اور عورت کے الفاظ سے اس مقام پر پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے انھیں چھوڑ کر یہاں میاں اور بیوی کے الفاظ استعمال کیے جائیں جو آیت کے شان نزول کے مطابق بھی ہوں گے

اوراس کے سیاق وسباق کے موافق بھی۔

اہل علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بعض اوقات الفاظ تو عموم میں لکھے جاتے ہیں، مگران کا موقع استعمال ان میں ایک نوعیت کی تخصیص پیدا کر دیتا ہے۔اور عام لفظ کا اس طرح تخصیص میں چلے جانے کا یہ اسلوب، کم وبیش ہر زبان میں مسلم قاعدے کی حیثیت رکھتا اور اہل زبان کی بول چال اوران کی تحریر وتقریر میں عمومی طور پر شائع وذائع ہوتا ہے۔ بولنے والے اسے معمول میں بولتے اور لکھنے والے بے تکلف لکھتے ہیں اوران کے مخاطبین بنا کسی الجھن میں پڑے اسے سمجھ لیتے ہیں۔اردو زبان میں بھی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''مرد تو نان ونفقہ کا بار اٹھا کر بچوں سے بے پروا ہو جاتے ہیں اور اصل قربانی عورت دیتی ہے'' تو اس جملے میں مرد سے باپ مراد لینے اور عورت سے ماں مراد لینے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔اسی طرح مذکورہ آیت میں بھی 'الرجال' اور 'النساء' کا ترجمہ جب مرد اور عورت کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کی ہدایات بالکل واضح کر دیتی ہیں کہ اس سے مراد بہرحال، میاں اور بیوی ہی ہیں؛ اور یہ سب سمجھ لینے میں کسی ''پیچیدگی'' کے آجانے کا ذرہ بھر امکان نہیں رہتا۔لیکن بفرض محال، زبان کا یہ سادہ اسلوب اگر کسی کی گرفت میں نہ بھی آسکے تو اس مسئلے کا حل بہرحال، یہ نہیں ہے کہ ہم زبان کی بے ساختگی اوراس کے حسن سے بے پروا ہو جائیں اوراس میں سہل ممتنع ٹانکنے لگیں، بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ ہم زبان کو اس کی فطرت ہی پر رکھیں اوراس کے اسالیب کی صحیح پرکھ، زبان ناآشناؤں میں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

نیز یہ بھی یاد رہے کہ اس طرح کے اسالیب برتنے میں محض زبان کے حسن ہی کا لحاظ نہیں ہوتا، بلکہ کچھ نہ کچھ معنویت بھی اس کا باعث ہوا کرتی ہے کہ جس کا ابلاغ متکلم کے پیش نظر ہوتا ہے۔اس آیت میں جولاریب، میاں بیوی کے تعلق سے آئی ہے، قرآن مجید اگر چاہتا تو 'الرجال' و 'النساء' کے بجائے وہ الفاظ بھی لا سکتا تھا جو زن وشو کے لیے عربی زبان میں عام مستعمل ہیں۔مگر اس نے وہ مخصوص الفاظ چھوڑ کر جو عمومی الفاظ اپنائے ہیں، اس کی ایک معقول وجہ اگر اس آیت کے سیاق پر نظر ہو تو بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

النساء کی اس آیت ۳۴ کی تمہید اصل میں آیت ۳۲ سے اٹھائی گئی ہے، یا دوسرے لفظوں میں آیت ۳۲ کی اصل ہے کہ جس پر یہ آیت متفرع ہوئی ہے۔اس میں بیان ہوا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِّلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ.

''اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے، اُس کی تمنا نہ کرو، (اِس لیے کہ) مردوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ انھیں مل جائے گا اور عورتوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ انھیں بھی

لازماً مل جائے گا۔‘‘

اس آیت میں جس فضیلت کی تمنا کرنے سے روکا گیا ہے وہ بلا اختلاف، مرد و عورت کی باہمی فضیلت ہے۔ مزید یہ کہ وہ اپنی حقیقت میں کسبی نہیں، بلکہ خلقی ہے۔ پہلی بات کی دلیل آیت میں مرد اور عورت کے الفاظ کا موجود ہونا ہے۔ دوسری بات کی دلیل خلقی کی تمنا چھوڑ کر کسبی کے حصول کی ترغیب دینا ہے۔ گویا یہ بات تمہید ہی میں واضح ہوگئی کہ مرد و زن کو ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ خلقی فضیلت ضرور حاصل ہے۔ اس کے بعد جب زن و شو کے معاملے میں ہدایات دینے کا موقع آیا کہ جس میں ایک فریق کو اس کی خلقی فضیلت ہی کی بنیاد پر قوامیت دی جانی ہے تو ظاہر ہے، یہاں میاں اور بیوی کے نہیں، مرد اور عورت کے الفاظ ہی موزوں ہو سکتے تھے جو تخصیص میں جا کر میاں اور بیوی کے رشتے کو بیان کرتے اور عموم میں رہتے ہوئے مرد کی وجۂ ترجیح کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے لفظ ’قوّام‘ کی تحقیق اور اس کے معنی کی تعیین پر تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ ’قام‘ جب عورت کے حوالے سے اور ’علی‘ کے صلے کے ساتھ آئے تو اہل لغت کے مطابق اس کا معنی شوہر کا بیوی کو روزی مہیا کرنا ہوتا ہے، اس لیے ’الرجال قوامون علی النساء‘ کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ شوہر بیویوں کی روزی کا بندوبست کرنے والے، یعنی ان کے مالی کفیل ہیں۔

ان کی اس بات سے ہمیں اتفاق ہے کہ ’قام‘ جب عورت کے حوالے سے اور ’علی‘ کے صلے کے ساتھ آئے تو اس کا ایک معنی عورت کو روزی مہیا کرنا بھی ہوتا ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ یہ اسی ایک معنی کے لیے آتا ہے، اس بات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل لغت اس ترکیب کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ’مانھا‘ ہی کہہ دینے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس کے ساتھ ’وقام بشانھا‘ کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ جس کا معنی مالی کفالت سے آگے بڑھ کر عورت کے جملہ امور کا ذمہ دار ہو جانا ہے۔ اب زبان کے اس قاعدے سے تو سبھی واقف ہیں کہ جب لغت میں کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی موجود ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی واحد صورت، اس لفظ کا موقع استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ’الرجال قوامون علی النساء‘ کے بعد بھی جب یہ جملہ آ جاتا ہے کہ وہ مرد اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں تو یہ بات حتمی ہو جاتی ہے کہ اس سیاق میں ’قوام علی‘ کا معنی بہر حال، مال خرچ کرنا نہیں ہے۔ اس معنی کی نفی ہو جائے تو یہاں دوسرا معنی یعنی، منتظم مراد لینے کا کم سے کم احتمال ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ احتمال اس وقت بالکل ہی قطعی[1] ہو جاتا ہے جب ’’نیک عورتیں شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں‘‘ کے

[1] اور یہ معنی کیا اس وقت بھی قطعی نہیں ہوگا جب عورت کے نشوز کی صورت میں مرد کو اسے سزا دینے کا حق بھی اسی سیاق میں بلکہ متصل بعد ہی بیان کر دیا جائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

الفاظ 'قوّام علی' میں پائے جانے والے منتظم کے معنی کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیتے ہیں۔ نیز، معاملات کا اس طرح ذمہ دار اور منتظم ہو جانا، اپنے اندر ایک طرح کا اِستعلا بھی رکھتا ہے، اس لیے محتاط مترجمین نے 'قوّامون علی' کا مطلب ایسے الفاظ سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن کے ذریعے اس استعلا کو بھی کسی حد تک نمایاں کیا جا سکے۔

'قوام علی' کی اس تحقیق کے ہوتے ہوئے اب یہ کہنا کچھ حیثیت نہیں رکھتا کہ ''مالی کفالت کے معنوں کی تائید 'وبما انفقوا من اموالھم' کے جملے سے بھی ہوتی ہے''۔ کیونکہ ایسا کہنا لغت اور سیاق سے کھلا ہوا اِعراض تو ہے ہی، جس طریقے سے اس پر دلیل لائی گئی ہے وہ عمل بھی کچھ ایسا وقیع نہیں کہ لفظ کا معنی متعین کرنے کے لیے اس پر اعتماد کیا جا سکے۔ کیونکہ 'بما انفقوا' کی 'ب' تو اصل میں یہ بتاتی ہے کہ یہ جملہ ابتدائی جملے کی وجہ بیان کرنے کے لیے آیا ہے، نہ کہ اُس کی نوعیت واضح کرنے کے لیے۔ یعنی قوامیت مرد ہی کو کیوں دی گئی ہے 'بما انفقوا' لا کر اس سوال کا جواب دیا گیا ہے، نہ کہ اس کے ذریعے سے قوامیت کا مفہوم متعین کیا گیا ہے۔ اس بات کو سمجھ لینے کے بعد اگر ترجمہ کیا جائے تو مسبّب اور سبب کا باہمی رشتہ بالکل واضح ہو جاتا اور معلوم ہو جاتا ہے کہ شوہر کو قوامیت دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مالی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے گا۔ لیکن پروفیسر صاحب کی تاویل میں مسبّب اور سبب کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس سے قطع نظر، دیکھیے مدعا کی صورت کیا سے کیا ہو جاتی ہے: ''شوہر کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے اوپر خرچ کرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس پر خرچ کرتا ہے۔'' گویا یہ آیت ذمہ داری اور اس کی وجہ کا بیان نہ ہوئی، کسی سزا کا بیان ہو گئی جو مرد بے چارے کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے ہی پر سنا دی گئی ہے۔

بہرکیف، اگر یہ طے ہو جائے کہ 'قوامون علی النساء' مالی کفالت کا بیان نہیں، بلکہ شوہروں کو بیویوں کے اوپر حاصل ایک طرح کی بالادستی کا بیان ہے تو اس کے بعد اس مفہوم کو ترجمے کا جامہ پہنانے میں ہر کوئی دوسرے سے اختلاف کر سکتا ہے، اور اس اختلاف کی بنیاد یہاں سے بھی اٹھا سکتا ہے کہ ایسے الفاظ جو موجودہ دور میں توحّش یا تنفّر کا باعث بنتے ہوں، ان سے پرہیز کرنا از حد ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں بھی حاکم، مسیطر اور متسلط کے الفاظ کا معاملہ یہی ہے کہ انھیں سنتے ہی ذہن میں ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے جو آج کی دنیا میں کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ لہٰذا ہم بھی سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے الفاظ کو چھوڑ دینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ محض مترجمین اور مفسرین کے اپنائے ہوئے الفاظ ہیں، لیکن انھیں چھوڑ کر جن الفاظ کا چناؤ کیا جائے وہ بہرصورت، قرآن مجید کے مدعا کا بیان ہونے چاہییں نہ کہ مرعوبیت کی نفسیات اور خودساختہ نظریات کا عکس۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شروع میں نقل کیے گئے ترجمہ میں ''سربراہ'' کا لفظ بڑا ہی معنی خیز ہے۔ فاضل

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مترجم کا یہ انتخاب جس طرح قرآن مجید کے مفہوم کو ادا کرنے کی اچھی کوشش ہے، اسی طرح حاکم ومتسلط جیسے الفاظ سے پیدا ہونے والے توحش اور پھر اسی بنیاد پر مسلم فکر پر ہونے والے اعتراضات کا بھی ایک اچھا جواب ہے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے آیت کے اگلے حصے 'بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض' کے ذیل میں کچھ وضاحت فرمائی ہے۔ان کی بیان کردہ وضاحت میں سے اس بات کے تو ہم بھی مؤید ہیں کہ یہ الفاظ مرد کی مطلق فضیلت کا بیان نہیں ہیں، لیکن ان کا یہ فرمانا کہ یہ فضیلت مالی کفالت کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے، اس بات کے ہم قائل نہیں ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہی کہنا مقصود ہوتا تو اصل عبارت یوں ہوتی: 'فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض بما انفقوا من اموالھم'۔لیکن دیکھ لیجیے، یہ عبارت 'بما' سے شروع ہوئی ہے اور اس کے دونوں حصے ایک واؤ کے ذریعے سے ملے ہوئے ہیں۔یعنی اس میں 'و بما انفقوا من اموالھم' کے الفاظ 'بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض' پر عطف ہو کر اور حرف جر کے اعادے سے آئے ہیں جو اس چیز کی بین دلیل ہیں کہ یہ دونوں فقرے آپس میں مسبب اور سبب کا رشتہ نہیں رکھتے، بلکہ یہ دونوں مل کر پہلے جملے کا سبب ہوتے ہیں۔آسان تر الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ مرد چونکہ خرچ کرتے ہیں، اس لیے صاحب فضیلت ہو جاتے ہیں، بلکہ یہ بیان ہوا ہے کہ ان کی خلقی فضیلت اور ان کا خرچ کرنا، یہ دو وجوہ ہیں کہ جن کی بنیاد پر یہ قوّام ہو جاتے ہیں۔

''اس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے'' یہ الفاظ اس معاملے میں تو واضح ہیں کہ یہ مرد کی کلی فضیلت کا اظہار نہیں ہیں، کیا یہ شوہر کی جزئی فضیلت کو بیان کرتے ہیں، اس بات کو سمجھنے میں اکثر اوقات تسامح ہو جاتا ہے۔لہٰذا ہم آیت کے اس جز کو کسی سوال کے جواب میں بیان کرنے کے بجائے ایجابی انداز میں بھی بیان کیے دیتے ہیں۔

زیر بحث آیت میں فضیلت کے بیان کی تین ممکنہ صورتیں ہو سکتی تھیں۔پہلی یہ کہ اللہ نے عورت کو مرد پر فضیلت دی ہے، دوسری یہ کہ اللہ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے، اور تیسری یہ کہ اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دے رکھی ہے۔ان میں سے پہلی صورت کا یہاں آ جانا تو ہرگز روا نہیں ہے، کیونکہ جب مرد کو سربراہ بنا دیا گیا تو اس کی دلیل میں یہ کہنے کا کوئی موقع نہیں رہا کہ عورت مرد پر برتری رکھتی ہے۔رہی دوسری صورت، تو وہ قیاس کے عین مطابق ہے کہ جب مرد کی سربراہی کا اعلان ہو تو اس کی دلیل میں مرد کی جزوی فضیلت کا بیان آئے تاکہ اس کے سربراہ ہونے کی وجہ بالکل واضح ہو جائے۔لازمی بات ہے کہ قرآن مجید اسی صورت کو اختیار کرتا اگر اس میں پائی جانے والی حکمت آسمانوں پر بننے کے بجائے زمین پر اور پھر منطق کے اصولوں پر بنی ہوتی۔لیکن اس نے اس قیاسی

اسلوب کو بھی چھوڑا اور 'بعضھم علی بعض' کی تیسری صورت کو اختیار کر لیا ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اُسے چھوڑنے اور اسے اختیار کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ ہمارے خیال میں اس احتراز و انتخاب کی وجہ یہ ہے:

آیت میں 'الرجال قوامون علی النساء' کا جملہ شوہر کے لیے بیوی پر ایک طرح کی بالادستی کا اظہار ہے، اس سے یہ گمان کیا جا سکتا تھا کہ شوہر کو حاصل ہونے والی یہ قوامیت شاید اس کی کسی مطلق فضیلت کی بنا پر ہے۔ اس کے بعد اگر یہ بھی کہہ دیا جاتا کہ یہ بالادستی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اس کو عورت پر فضیلت بخش رکھی ہے تو یہ جملہ اس کی مطلق فضیلت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا، حالاں کہ ایسی فضیلت مرد کو حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں کوئی ایسا جملہ ہی موزوں ہو سکتا تھا جو ممکنہ غلط فہمی[2] کا ازالہ کرتا اور یہ بھی بیان کر دیتا کہ خاندان کے دائرے میں جو فضیلت مرد کو حاصل ہو گئی ہے اس کی گنجایش اسی اصول پر پیدا ہوئی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ فضیلت ضرور رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے، یہ بات 'بعضھم علی بعض' کے عمومی اسلوب کو چھوڑ کر کسی اور طرح سے کہہ دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

آیت میں 'فالصالحات قانتات' کے الفاظ بیوی کو واضح طور پر ترغیب دیتے ہیں کہ وہ شوہر کی فرماں بردار بن کر رہے کہ یہ اس کے سربراہ ہونے کا لازمی تقاضا ہے، لیکن شوہر کے اس حق اطاعت کو مان لیا جائے تو ہمارے ممدوح کا سارا استدلال اپنی بنیاد ہی کھو دیتا ہے، اس لیے انھوں نے اس پر بھی خاصی تفصیل سے بحث فرمائی ہے۔ انھیں پہلے تو اس بات پر اصرار رہا ہے کہ ''قـنـت' کا لفظ صرف اور صرف دین کے بارے میں اطاعت اور نیکی پر دلالت کرتا ہے''۔ پھر اس کی تائید میں شرعی دلیل انھوں نے کچھ یوں بیان فرمائی ہے: ''اس لیے قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے خاص ہے۔'' اور آخر کار یہ فیصلہ بھی فرما دیا ہے ''کسی شخص کی اطاعت کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں [ہے]۔''

ہم طالب علم جس عربی زبان کی شد بد ہونے کا گمان رکھتے ہیں، اس میں 'قنت' کے لفظ کو ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اسے دینی معاملات میں استعمال کیا جائے یا پھر دنیوی امور میں۔ یہ بے چارا خدا کے سامنے بچھ جانے

۲؎ ممکنہ شبہات کو رفع کرنے کا یہ انداز، قرآن مجید کا عام طریقہ ہے۔ اس کی مثال میں وہ آیت بھی دیکھ لی جا سکتی ہے جو میاں بیوی کے حوالے ہی سے آئی ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے: 'وللرجال علیھن درجة' کہ مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ یہ ترجمہ 'درجة' کی تنوین کو تنکیر کی تنوین سمجھ کر کیا گیا ہے۔ ہو سکتا تھا کوئی دوسرا اِسی کو تفخیم کی تنوین مان کر اس کا ترجمہ 'بہت بڑا درجہ' کرتا اور اس طرح مرد صاحب کو جا عرش پر بٹھاتا۔ لیکن قرآن مجید نے اس متوقع احتمال کو 'ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف' کہہ کر یک سر مسترد کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس آیت اور زیر بحث آیت میں فرق بس یہی ہے کہ یہاں ممکنہ شبے کا رد پہلے ہی سے کر دیا گیا ہے اور وہاں یہی عمل بعد میں ادا کیا گیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں جس طرح فخر محسوس کرتا ہے، اسی طرح شوہر کی بھی کچھ نہ کچھ مان لینے میں اسے ''عار'' نہیں ہے۔ جیسے 'قنت للّٰہ' اہل زبان کا محاورہ ہے ایسے ہی 'قنت المراۃ لزوجھا' بھی انھی کا محاورہ ہے۔ اور پھر 'امراۃ قنوت' کی اصطلاح جو ہوسکتا ہے 'رجال قنوت' کی نازک طبیعتوں پر بہت ہی گراں بار ہو، بہر حال، اہل عرب کی وضع کی ہوئی اصطلاح ہی ہے، نہ کہ پنجاب کے کسی زورآور مجازی خدا کی۔

اسی طرح ان کی یہ بات بھی کہ لفظ 'قنوت' قرآن مجید میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ خاص ہے، ہمارے لیے کچھ قابل فہم نہیں ہے۔ اس لیے کہ لفظ کا اس طرح خاص ہوجانا، خود زبان کی شہادت کی بنیاد پر ہوگا یا پھر کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر۔ زبان میں اس لفظ کے خاص ہو جانے کی نہیں، الٹا اس کے عام ہونے کی شہادت پائی جاتی ہے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح شرعی مصادر میں بھی ایسی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی جو یہ بتاتی ہو کہ اللہ اور رسول نے اس لفظ کو اپنی اطاعت کے لیے خاص کر رکھا ہے۔

دراصل، آیت کے اس جزو میں اصل مسئلہ 'قانتات' کے متعلق کی تعیین کا ہے کہ وہ 'الرجال' ہے، یا پھر لفظ 'اللّٰہ'۔ کیونکہ 'قانتات' کو 'الرجال' سے متعلق کریں گے تو معنی ہوگا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی اطاعت گزار ہیں، اور اگر اسے لفظ 'اللّٰہ' سے متعلق کر دیں گے تو مطلب ہو جائے گا کہ وہ بیویاں اللہ کی اطاعت گزار ہیں۔ سیاق کلام میں مفعول کی اس تعیین کے جو ممکنہ وجوہ ہو سکتے ہیں، ان کا ذکر ہم ذیل میں کیے دیتے ہیں:

اول، بڑی سادہ سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شوہر کو سربراہ بنایا تو پہلے اس تقرر کے دلائل دے دیے اور پھر اُس کی سربراہی کا لازمی تقاضا، یعنی بیوی کی اطاعت گزاری کا بیان کر دیا اور بس۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو درمیان میں آجانے والے جملے معترضہ قرار پاتے اور 'قانتات' اور 'حافظات' کے الفاظ براہ راست 'الرجال' سے متعلق ہو جاتے ہیں۔

دوم، 'فالصالحات قانتات' کے ساتھ ایک 'ف' بھی آگئی ہے جو بہر حال، زائد نہیں ہے۔ اگر اس کا حق صحیح طور پر ادا کیا جائے تو یہ الفاظ اصل میں ان عورتوں کے صالح ہونے کا بیان ہیں جو اپنے شوہروں کی سربراہی کا لازمی تقاضا مان لیتی ہیں۔ یعنی ان میں یہ بیان ہوا ہے کہ شوہر چونکہ سربراہ ہیں اور بیویوں پر اس وجہ سے ان کی اطاعت لازم ہے، چنانچہ نیک بیویاں وہی ہیں جو ان کی اطاعت گزار ہیں۔ سو اس طرح بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں 'الرجال' کا لفظ ہی 'قانتات' کا مفعول ہے۔

سوم، آیت کے اسی حصے میں 'حافظات للغیب' کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ ان کا مفہوم کوئی بھی یہ نہیں بیان

کرتا کہ وہ عورتیں اللہ کے رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، بلکہ سب کے نزدیک اس کا مفہوم یہی ہے کہ وہ شوہروں کے رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اور ایک دوسری تاویل کے مطابق، وہ شوہروں کی غیر موجودگی میں حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی ہر دو صورت میں اس کا متعلق 'الرجال' ہی قرار پاتا ہے۔ اب یہ بھی طے ہے کہ 'حافظات' کا یہ لفظ 'فالصالحات' کی دوسری خبر ہے اور اس طرح 'قانتات' میں، جو کہ پہلی خبر ہے، اور اس میں ایک واضح مناسبت بھی ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے جب ہم 'قانتات' کا مفعول طے کریں گے تو وہ بھی ظاہر ہے، وہی ہوگا جو 'حافظات' کا ہے۔ تالیف یہ ہوگی: 'قانتات للرجال و حافظات لغیبھم'۔

چہارم، ہماری علمی تربیت کے لیے قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر یہ طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ وہ ایک مشفق استاد کی طرح پہلے تو کچھ چیزوں کو اجمال میں ذکر کرتا، پھر ان کی طرف کچھ اشارے کرتا چلا جاتا اور آخر کار انھیں بالکل کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اس نے پہلے تو 'قانتات' کے مفعول کو حذف کیا ہے، پھر 'حافظات للغیب' میں اس کی طرف کچھ اشارہ کر دیا ہے، اور اس کے بعد 'فان اطعنکم' کے الفاظ میں 'اطعن' سے 'قانتات' کا معنی اور 'کم' کی ضمیر مخاطب سے اس کے مفعول کو بالکل ہی واضح کر دیا ہے کہ یہ کوئی اور نہیں، بلکہ 'الرجال' ہی ہے۔

مزید یہ کہ قرآن مجید کے مدنظر بھی اگر یہی بیان کرنا ہوتا کہ بیویاں اللہ کی فرماں بردار ہیں، جیسا کہ ہمارے ممدوح کی رائے ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ 'قانتات' کے لفظ کو 'فالصالحات' کی خبر بنا کر کیوں لاتا؟ پھر تو 'فالصالحات القانتات حافظات' کا اسلوب زیادہ موزوں ہوتا۔ یعنی ''جو نیک عورتیں ہیں، وہ فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں''، اس کے بجائے یہ کہا جاتا کہ جو نیک فرماں بردار عورتیں ہوتی ہیں، وہ رازوں کی حفاظت کرتی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے اپنی رائے کو مؤکد کرنے کے لیے لغوی اور شرعی دلائل ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کچھ معنوی دلائل بھی فراہم کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میاں اور بیوی کے باہمی تعلقات ایک ساتھی اور شریک حیات کے ہوتے ہیں نہ کہ حاکم اور محکوم کے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ حاکم ومحکوم کے تعلق میں محبت، سکون اور اطمینان کی فضا کبھی قائم ہی نہیں ہو سکتی، ہاں، رفاقت، مشورہ اور باہمی رضامندی اس کی ضامن ضرور ہے۔ پھر قرآن میں بیوی کے لیے استعمال کیے گئے 'صاحبہ' اور 'زوج' کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے میاں بیوی میں پائی جانے والی یکسانیت، ہم رنگی اور پیوستگی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس ضمن میں اگر ذیل کی چند گزارشات پر بھی نظر رہے تو امید ہے کہ ہم افراط وتفریط کے بجائے راہ اعتدال پر قائم رہ سکیں گے:

پہلی یہ کہ اس بات میں کس کو شک ہوسکتا ہے کہ مرد وعورت کا نکاح اصل میں رفاقت کے پیمان ہی کا دوسرا نام ہے اور ان کے باہمی تعلقات کی خوش گواری اسی میں ہے کہ وہ حاکم اور محکوم کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اچھے دوستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کریں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نکاح محض مرد وعورت کی رفاقت ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک خاندان کے ادارے کی بنیاد رکھنے کا اعلان بھی ہے۔ اور ادارے کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ اس کی نوعیت خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی منتظم (نہ کہ حاکم) بھی ضرور ہو۔ مزید یہ کہ یہ منتظم ہو بھی صرف ایک ہی کہ ادارے کی بقا اس کی دوئی کا بار اٹھا لینے سے قطعی طور پر قاصر ہوا کرتی ہے۔ غرض یہ کہ بحث اس میں نہیں ہے کہ نکاح کے بعد خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے یا نہیں اور اس ادارے کا ایک سربراہ بھی ہونا چاہیے یا نہیں، بلکہ بحث صرف اس میں ہے کہ مرد اور عورت میں سے وہ کون ہے جس کو اس ادارے کا سربراہ بنایا جائے۔ اس کا جواب دین کی تعلیم میں یہ ہے کہ یہ ذمہ داری مرد کو سونپی جائے۔ مرد ہی کو کیوں سونپی جائے، اصل میں 'بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم' کے الفاظ اسی بات کی دلیل میں آئے ہیں کہ مرد میں چونکہ قوامیت کی خلقی صلاحیت دوسرے فریق سے زیادہ موجود ہے اور گھر در کی مالی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی کے اوپر لادا گیا ہے، اس لیے مناسب یہی ہوا ہے کہ اسے ہی سربراہ بنایا جائے۔

دوسری یہ کہ ادارے کا ایک سربراہ وہ ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے جنم لیتا، کسی کے نفع ونقصان سے بے پروا ہوتا، ہر جگہ ذاتی مفاد سامنے رکھتا اور اپنے ماتحتوں کے جسم سے آخری قطرہ خون بھی چوس لینے کو بے قرار ہوتا ہے۔ اس کے مقابل میں دوسرا وہ ہے جو کسی غیر کا نہیں، اپنے گھر اور خاندان، اپنی بیوی اور اپنے ہی بچوں کی ماں کا سربراہ ہوتا ہے۔ اور پھر صرف سربراہ ہی نہیں، اس کا زوج اور صاحب ہوتا، اس کے نفع ونقصان میں شریک، اس کے دکھ سکھ کا ساتھی اور اس کی جلوت وخلوت کا ہم نشین بھی ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ پہلا سربراہ اور اس کے متعلقین، یہ سب ذاتی مفادات کے اسیر ہوتے ہیں، اس لیے ان میں باہمی الفت پیدا ہو جانا انتہائی مشکل امر ہو جاتا ہے؛ مگر یہ تو وہ ہیں کہ ان کا ہر مفاد جس قدر ذاتی ہے، اتنا ہی مشترک بھی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہوتی ہے کہ مشترک مفاد کے حصول کی کوشش بالعموم، ان میں محبت بنائے رکھتی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے سربراہوں میں کیا ذرہ بھر بھی نسبت ہے کہ ہم ایک کی مادہ پرستی کا ہوّا دکھائیں اور دوسرے کو جی بھر کر مطعون کریں؟ ایک کی خود غرضی کا اشتہار دیں اور دوسرے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے خلوص کو یک سر رد کر دیں؟ یا پھر ایک کی زیر دستوں کے ساتھ بے اعتنائی کو دلیل بنا لیں اور اسی بنا پر دوسرے کی حساسیت اور محبت کی بھی نفی کر دیں؟ اور ستم بالاے ستم یہ کہ اپنے اس طرز کو علم اور تحقیق کا عنوان بھی دے ڈالیں!

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہر دور میں کچھ خام باتیں علم و عرفان کی معراج خیال کر لی جاتی ہیں۔ بعد کے دنوں میں انھی کی بنیاد پر باقاعدہ نظام فکر وجود میں آ جاتے اور آخر کار وہ وقت آتا ہے کہ ہر سو انھی کا رواج ہو جاتا اور ہر دم انھی کی تقدیس گائی جانے لگتی ہے۔ عمومی قبولیت کا یہ عمل ہوتا بھی اتنا زور آور ہے کہ اس کے مقابلے میں کھڑے ہونا اور اس سے متضاد بات کہنا، انتہائی مشکل اور جان لیوا ہو جاتا ہے۔ مرد و زن کی غیر فطری مساوات کا آج کل جو غلغلہ ہے، یہ بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔ اس میں بھی پہلے تو یہ فرض کر لیا گیا کہ مرد اور عورت ہر حیثیت میں برابر ہوتے ہیں۔ پھر اس مفروضے کو فلسفیانہ بنیادیں فراہم کی گئیں اور عقلی انحرافات کے ذریعے سے مسلسل اس کی آبیاری کی گئی۔ اور اس کے بعد مساوات کا بہت ہی پر کشش عوامی نعرہ ایجاد کر دیا گیا کہ جو دلوں کو فریب دینے اور عام درجے کی دانش کو گم راہ کر دینے کے لیے بڑا ہی کارگر حربہ ثابت ہوا۔[۳] جن کے دل اس نعرے نے لبھا لیے ہیں اور جن کی عقلیں اپنے دام میں لے رکھی ہیں، انھیں اب لاکھ سمجھایا جائے وہ نہیں سمجھتے کہ جب انسان ہونے کے باوجود، مرد و عورت اپنی حقیقت ہی میں مختلف ہیں تو اسی قدرتی تقسیم کی بنیاد پر اگر ان میں حقوق اور فرائض کی تقسیم بھی مان لی جائے تو اس پر آخر اعتراض کیا ہے؟ اور زیر بحث مسئلے میں بھی کیا رتی بھر اس سے زیادہ کچھ ہوا ہے کہ مرد و عورت کے مابین حقوق و فرائض کو کچھ وجوہ کی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا ہے، اور یہ تقسیم بھی کسی جانب داری کے تحت نہیں، بلکہ فطری اصولوں اور انصاف کے تقاضوں کے تحت ہی کی گئی ہے؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۳؎ ہم سمجھتے ہیں کہ مرد و زن کی غیر فطری مساوات کا جو اس قدر شور ہو گیا ہے، اس میں اس مثل کا بھی بڑا دخل ہے جو کہتی ہے کہ میاں اور بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ گاڑی کے دو پہیے ہی ہیں، مگر اگلے زمانوں میں یہ پہیے چونکہ یکے کے خیال کر لیے گئے تھے کہ جس سے یہ سب مسائل پیدا ہو گئے ہیں، اس لیے ہم یہ اصلاح تجویز کریں گے کہ نئے زمانے کی رعایت سے اس مثل میں یکے کی جگہ اب بائیسکل برت لینی چاہیے۔ پہیے اس کے بھی دو ہی ہوں گے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ ایک آگے ہو گا اور ایک پیچھے۔ وگرنہ یکے کے پہیے برابری کے جذبات میں ''آمنے سامنے'' تو ضرور آ جائیں گے، مگر گھوڑا آگے جت جانے سے یہ دونوں پیچھے بھی رہ جائیں گے۔